شبانہ امان اللہ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو
گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، راولپنڈی

منشا یاد کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

ABSTRACT

Analytical study of Mansha Yaad's short stories
By Shabana Amanullah, Assistant Prof. Govt. Degree College for Women, Rawalpindi.

Mansha Yaad is a famous short story writer of Urdu. His style of writing is unique and presents a blend of tradition and modernism. He describes local landscape with accuracy. This article evaluates Mansha Yaad's topics and his style of writing. The analysis shows Yaad's sensibility and images in his short stories, with which he created a peculiar atmoshpher and effects.

منشا یاد اُردو افسانہ نگاری میں ایک معتبر اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُردو افسانہ نگاری کی روایت نے کئی کروٹیں بدلیں، کئی نشیب و فراز عبور کیے؛ گزرتے وقت کے ساتھ اُمڈتے نظریات سے اثر پزیری حاصل کی اور پھر ایک سیلِ رواں کی طرح یہ سفر آج تک جاری و ساری ہے۔ اس سفر کے دوران میں کبھی ترقی پسند نظریات نے چشمِ تماشا کو کئی منظر دکھائے، کبھی روحانیت کی گود میں شعورِ انسانی کو لوریاں سنائی گئیں، کہیں حلقہ ارباب ذوق کے ادبا نے اپنا اپنا اندازِ فکر افسانے کے روپ میں ڈھال کر قاری کے سامنے رکھا۔ مغربی نظریات بھی دل و دماغ کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری پر گہرے اثرات مرتب کرتے گئے۔ وجودیت، تاثریت، تجریدیت، علامت نگاری، جدیدیت، لسانی تشکیلات جیسی تحریکیں بھی افسانہ نگاری پر گہرے نقوش چھوڑ گئیں۔ اس تمام سفر میں اگر ہم منشا یاد کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیں یوں اُنھوں نے ۱۹۵۰ء کی دہائی کے آخر میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ ''بند مُٹھی میں جگنو'' سے لے کر ''اک کنکر ٹھہرے پانی میں'' تک منشا یاد نہ صرف ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں بل کہ گذشتہ چھ دہائیوں سے معاشرتی، سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کے عکاس بھی ہیں۔

اُنہوں نے اپنے نوکِ قلم سے معاشرے میں موجود مسائل کو چھوا، محسوس کیا، خود پر طاری کیا اور افسانے کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ اُن کے افسانے صرف تفننِ طبع یا لذّت آفرینی کے لیے نہیں ہیں بل کہ وہ ایک ماہر مصور کی طرح لمحہ بہ لمحہ بدلتے سماج، بھوک، افلاس اور نفسیاتی عارضوں میں مبتلا انسانی رویوں کو افسانے کے کینوس پر پینٹ کرتے

چلے جاتے ہیں۔ معاشرتی جبر اور ناانصافی، معاشی استحصال، شعور اور ذہن میں جنم لینے والے سوچ اور تفکر کے جال کو منشایاد جب لفظوں کی زبان میں پیش کرتے ہیں تو اُن کے افسانے گذشتہ ساٹھ سالوں کی تاریخ پیش کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔ منشایاؔد کو فطرت نے کہانی نویس بنایا۔ ذوقِ بزم آرائی اور ذوق داستان سرائی اُن کو اپنے گھر کے ماحول سے عطا ہوا۔ طبیعت کی حساسیت نے اُنھیں عام سطح سے ہٹ کر چیزوں کو دیکھنے، محسوس کرنے اور اُن کے باطن میں اُتر کر عمیق مشاہدے کی صلاحیت عطا کی۔ شاعرانہ مزاج رکھنے والا یہ فنکار افسانہ تخلیق کرنے کے لیے اپنے اندر کے شاعر کو تیاگ دیتا ہے اور اپنے دل و دماغ میں پرورش پانے والے کرداروں کی وسیع دنیا کو ظاہر کے آئینے میں پیش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں موضوعات، اسالیب اور فکر کا تنوع موجود ہے۔

منشایاؔد نے اپنی افسانہ نگاری کے ضمن میں بہت سے سینئر افسانہ نگاروں سے اثر قبول کیا۔ لیکن شعوری طور پر ان میں سے کسی کی تقلید نہیں کی اور نہ ہی کسی سینئر افسانہ نگار کے فکر و اسلوب کا سحر اُن کو گرفتار کر سکا۔ منشایاؔد نے اندازِ بیان اور اظہار کی راہیں خود متعین کیں۔ منشایاؔد کی افسانہ نگاری دیہی اور شہری زندگی کی زندہ تصاویر اور اُن سے تراشیدہ حقیقی کرداروں کو فن کے سانچے میں ڈھالتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں نچلے طبقے کے لوگوں کو جو گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں، محض جبلتوں کے سہارے جیتے ہیں اور ازل سے بھوک مٹانے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں، قوتِ گویائی عطا کرتے ہیں۔ ایک طرف تو گاؤں کی زندگی کی جھلکیاں اپنی جزئیات کے ساتھ ملتی ہیں اور دوسری طرف شہری ہماہمی، بیورو کریسی کی اجارہ داری، سیاست کی سجی اُلٹی بساط اور خوف و دہشت کے زیرِ اثر سہمی ہوئی انسانی نفسیات کا بھرپور تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

منشایاؔد مصلح نہیں اور نہ ہی وہ مصلح بننا چاہتے ہیں۔ وہ اظہار کے کئی قرینے پیش کرتے ہیں۔ مختلف کرداروں کے باطن میں اُتر کر اُن کی کیفیات کو خود پر طاری کر کے حتیٰ کہ حیوانات کی کھال اور نباتات کی جڑوں میں گھس کر اُن کے اصل جوہر کی جستجو کرتے ہیں۔ وہ دنیا کو ایک اکائی تصور کرتے ہیں۔ تجریدیت، علامت نگاری کے دور میں بھی اعتدال کو اپنے فن کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں۔ اُن کا تصورِ افسانہ نگاری بہت واضح ہے۔ بقول منشایاؔد:

> ''میرے نزدیک افسانہ ایک ایسا مختصر نثر پارہ ہے جس میں کسی واقعہ، منظر، خیال، جذبہ، تجربہ، احساس، کردار یا روحانی کیفیت کو ایسے بہترین اور موثر انداز میں پیش کیا جائے کہ وہ پڑھنے والے کو متاثر کرے اور اُس کی یاداشت کا حصہ بن جائے اور اُسے زندگی کے معاملات و مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور شعور بخشے(۱)۔''

ان کے بیشتر افسانے اسی تصورِ تخلیق کے غماز ہیں۔ یہ اُن کی ژرف نگاہی اور گہری حساسیت سے نمود پا کر

موضوعات اور فکر وفن کے تنوع کے آئینہ دار ہیں۔ اُن کی سوچ استدلالی ہے۔ وہ ترقی پسند نظریات کے قائل ہیں۔ جمود، ٹھہراؤ اور روایت پسندی سے صرفِ نظر کر کے ہر دور میں وقوع پزیر ہونے والی تبدیلیوں کو افسانے کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کسی خاص مکتبہ فکر سے نتھی نہیں کرنا چاہتے کیوں کہ جب بھی کوئی فنکار خود کو کسی خاص نقطہ نظر کے تابع کر دیتا ہے تو وہ اپنے اردگرد کی دنیا کو اسی کی عینک سے دیکھتا ہے۔ اُس کا اپنا آزاد اندازِ فکر اُس مکتبہِ فکر کی قید میں ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منشایادؔ خود کو، اپنی آزادیِ فکر کو کسی بھی مخصوص نظریے کا اسیر نہیں کرنا چاہتے۔ اسی لیے وہ کما حقہ سعی کرتے ہیں کہ اپنا نقطہ نظر افسانوں کی آبیاری کے لیے استعمال کریں۔ جہاں تک اُن کا پلاٹ سے افسانہ نگاری تک کے سفر کا تعلق ہے وہ سب سے پہلے خیال کی پنیری لگاتے ہیں۔ اگر اُس میں نمود کی گنجائش ہو تو پھر پلاٹ کی تشکیل کرتے ہیں۔ کرداروں کی تخلیق کرتے ہوئے اُن سے مخاطب ہو کر اُن کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں پھر اس سارے عمل کو ذہن کی بھٹی کے سپرد کر کے بالآخر ایک افسانے کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

وہ اپنی افسانہ نگاری کے عمل کو انڈے سینے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اگر وہ پتھریلے نہ ہوں تو کچھ عرصہ بعد انڈوں سے خول توڑ کر بچے باہر نظر آتے ہیں اور ذہن چوں چوں کی آوازوں سے بھر جاتا ہے۔ کہانی تخلیق کرنے کی صلاحیت اُن کو وہبی طور پر عطا کی گئی۔ اُن کے اندر کی کہانیاں اُن کو باہر کی دنیا میں پیش کرنے پر اُکساتی رہتی ہیں۔ اس لیے منشایادؔ ایک حقیقی فنکار ہے۔

منشایادؔ نے ابتدائی کہانیاں روایتی اور وضاحتی اسلوب کے تحت لکھیں مگر عصری تبدیلیوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ علامتی، تجریدی اور نیم علامتی کہانیاں لکھنے کے باوجود کہانی پن سے پہلو تہی نہیں کی۔ چونکہ وہ ترقی پسندانہ فکر کے حامل ہیں لہٰذا وہ جدیدیت کی تحریک کو ترقی پسند افسانے کے لیے حیاتِ نو قرار دیتے ہیں۔ وہ اُن افسانہ نگاروں کی صف میں نہیں کھڑے ہوتے جو لسانی تشکیلات کی آڑ میں بے ڈھب اور مہمل جملے بازی کو جدیدیت قرار دیتے ہیں اور افسانوں کے اہم حصّوں، کردار، پلاٹ اور کہانی کو چھوڑ دیتے ہیں۔ جس افسانے میں یہ اجزا نہیں ہونگے وہ روکھا پھیکا ہی ہوگا۔ ستّر کی دہائی میں ایک معتدل اور متوازن رجحان افسانہ نگاری میں رواج پایا تو منشایاد نے اس کی پزیرائی کی اور نئے تجربوں کو افسانہ نگاری کے لیے تازہ خون قرار دیا۔ چوں کہ وہ افسانہ نگاری کو بنیادی طور پر نیم بیانیہ قرار دیتے ہیں اس لیے بیانیہ کے نئے نئے امکانات کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔

منشایاد کی افسانہ نگاری میں میں تمام عناصر اور اجزا کو اُن کے مخصوص مقام کے مطابق برتا گیا ہے۔ مگر تھیم، پلاٹ، اسلوب، کردار نگاری، منظر نگاری، نقطہ نظر، ہیئت اور تکنیک وغیرہ میں ایک توازن کا احساس موجود ہے۔ غزل کی طرح ایمائیت اور ایجاز واختصار کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اسی ایجاز واختصار کی ایک کڑی اُن کے افسانچے بھی ہیں جن کے

بارے میں وہ خود فرماتے ہیں کہ اُن کے اندر اتنی کہانیوں کا انبار باقی ہے کہ اُن تمام کا لکھا جانا ایک زندگی میں ممکن نہیں اس لیے کیوں نا اُنہیں افسانچوں میں ڈھال دیا جائے۔اُن کے نئے مجموعے''اک کنکر ٹھہرے پانی میں'' یہ افسانچے موجود ہیں جو اختصار کے ساتھ ساتھ منشا یاد کی فکر اور فن کے کئی دریچوں کو وا کرتے ہیں اور بہت کم لفظوں میں بہت کچھ کہہ جانے کے ہنر کی گواہی دیتے ہیں۔

منشا یاد افسانہ نگاری کے فنی اور فکری پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے ہوئے آغاز سے اختتام تک ایک تسلسل کا احساس پیش کرتے ہیں۔افسانے کا آخری جملہ اُن کے مطابق ایسا ہونا چاہیے جو کسی بات کا انکشاف کرے اور تکمیل کا احساس پیدا کرے۔منٹو جیسا بہترین افسانہ نگار بھی اپنے افسانوں کے آخری جملوں کی بدولت لازوال ہوا اور منشا یاد کے افسانے بھی اسی انداز کے جملے پیش کرتے ہیں جیسے ایک چھنا کا ہو اور چاروں طرف روشنی پھیل جائے۔ڈاکٹر اقبال آفاقی کہتے ہیں:

''محمد منشا یاد بنیادی طور پر Three Dimensional Perception کا افسانہ نگار ہے۔اس کے ہاں ساری جہتوں اور سمتوں کا اعتبار قائم ہے۔کسی ماہر بت تراش کے طرح خارج سے باطن کی دریافت کرتا ہے۔یوں اس کے افسانے یک طرفہ اور یک رخ حقیقتوں کے احوال نہیں بلکہ تجرید کے لمس اور علامتوں کی تدبیر کاری کے باوجود زندگی کی بھرپور شیئیت سے لباب دو طرفہ حسی شراکت کے عکس نما ہیں۔جن میں وہ تیسرا رخ بھی شامل ہو جاتا ہے جس کی روشنی میں سوئی اور زندگی سے عاری اشیا کے مہکتے سانس کو اُس نے افسانے کی دنیا میں نئے سیاق و سباق کے ساتھ بحال کیا ہے۔بحال ہی نہیں کیا ان گونگے بہرے لوگوں کو زبان بھی دی ہے۔یہ امر اس کے لیے ارتکاز مانگتا ہے کہ ہمارے عہد میں ادراک کا میدان چیخ رہا ہے زماں و مکان میں دراڑیں اُبھر رہی ہیں۔سائیکی اور سوسائٹی دو اجنبی اور لاتعلق صورتیں ہیں سمتیں اور جہتیں اضافیت کے گھیرے میں ہیں اور۔۔۔خواہشیں سراب ہیں۔اور منزلیں نایاب۔۔۔ہمارے بہت سے افسانہ نگار اس بڑھتے ہوئے ویسٹ لینڈ میں گرفتار ہیں۔اس بنتے بگڑتے تناظر میں محمد منشا یاد نے ایک تسلسل کا ایقان فراہم کیا۔ہمارے ماحولیاتی عمل کو حرکت کی نوید دی ہے۔ماوراء واقعیت، فلیش بیک کا یا کلپ صورتحال اور شعور کی رو ایسے پیٹرنز میں لکھنے کے باوصف۔اس کے افسانوں میں ہمارے لمحوں کے رابطے موجود زندگی کا حوصلہ

سلامت اور وژن کا قیام ہے (۲)۔''

منشایاؔد نے دیہی ماحول کو بہت قریب سے دیکھا۔ اُن کے شعور نے اسی فضا میں آنکھ کھولی۔ دیہی زندگی کے فیوض و برکات اور اُن کی قباحتوں نے اُن کی فکر پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ گاؤں میں طبقاتی کشمکش اور تفاوت اُن کی سوچ کو خاص جلا بخش گئی۔ ان تمام مسائل نے ایک مہمیز کا کام کیا اور اُن کے اندر کے افسانہ نگار کو مجبور کیا کہ وہ کمزور بے بس، پسے ہوئے لوگوں کو موضوعِ بحث بنائیں۔ اُنھیں وہ حیات نو اور پائندگی عطا کریں جو اس سے پہلے نہیں ملتی تھی۔ مہر و سانسی، ناتو سانسی، کوڈو فقیر، دِتا کمہار، علیا جیسے لوگوں کو تاریخ کبھی یاد نہیں رکھتی۔ یہ انسان نہیں کیڑے مکوڑے سمجھے جاتے ہیں مگر منشایاد کی افسانہ نگاری نے اُن معمولی انسانوں کو ابدیت عطا کر دی۔ منشایاؔد فطرت سے محبت کرتے ہیں۔ وہ حساس انسان ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ کس طرح انسان اپنے مرکز سے دور ہو رہا ہے مشینوں کی حکومت، گلوبل ویلج کے عالمگیر تصور اور اندھی سائنسی ترقی نے بنی نوع انسان کی زندگی، رویوں، فکر و منظر اور تہذیب و تمدن پر کیا کیا اثرات مرتب کیے ہیں اس کا اندازہ منشایاؔد کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے۔

> ''سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے ساتھ انسان روز بروز مشین میں ڈھلتا جا رہا ہے اور نِت نئے تباہ کن ہتھیار ایجاد کر رہا ہے۔ کمپیوٹر کی ترقی نے اس ادبی اور شعری ذوق سے اور بھی دور اور بیگانہ کر دیا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ زندگی کے سچے ذائقوں کے لیے مار دھاڑ کی وڈیو گیمز کی بجائے نسلِ نو میں شعر و ادب کا ذوق بحال کیا جائے اور اُنہیں ہلے گلے (Thrills) کی مصنوعی اور ہنگامی وقت گزاری کی بجائے سچی خوشی اور لطف انبساط سے متعارف کرایا جائے۔ جو کلاسیکی موسیقی اور شعر و ادب کی دنیا کے علاوہ کہیں نہیں پائی جاتی (۳)۔''

انسان نے ستاروں پر کمند ڈالنے کے شوق اور طاقت کے حصول کے جنون میں دنیا کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنا ایکوسسٹم تک تباہ کر دیا ہے۔ اسی احساس کی عکاسی اُن کے ایک افسانے ''ایک تھی فاختہ'' میں ہوئی جہاں سارا شہر چھان لینے کے باوجود اُنھیں فاختہ نہیں ملتی۔ کتنی خاموشی اور کتنی گونگی بے حسی کے ساتھ انسان نے اپنے قدرتی اور فطری نظام کو تباہ کر دیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ ماڈرن ازم کے نشے میں دُھت آج کے جدید انسان کو اپنے اس جرم کی صدائے باز گشت بھی سنائی نہیں دیتی۔ مذکورہ افسانے کے یہ آخری جملے بہت سے اسرار عیاں کرتے ہیں:

> ''پریشانی کی کوئی بات نہیں فاختائیں ختم نہیں ہو گئیں اور نہ ہی ملک چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ بعض شہروں کے باغوں میں کوے بہت ہو گئے ہیں

اور جہاں کوے زیادہ ہو جائیں وہاں سے فاختائیں ہجرت کر جاتی ہیں (۴)۔''

ایک اور پیراگراف مصنف کے اسی نقطہ نظر کو واضح کرتا ہے:

''مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب کچھ عرصہ پہلے شہر کے اسلحہ ڈپو میں دھماکے ہوئے تھے سنا تھا بہت سی فاختائیں مر گئی تھیں۔ کیا پتہ ساری مر گئی ہوں یا جو بچ گئی ہوں مزید دھماکوں کے ڈر سے شہر چھوڑ کر دور جنگلوں پہاڑوں کی طرف نکل گئی ہوں (۵)۔''

بظاہر اس میں اوجڑی کیمپ کے سانحے کی طرف اشارہ ہے۔ مگر حقیقت میں سائنسی ترقی کے وہ اثرات جو ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور نت نئے اسلحہ گولہ بارود کی وجہ سے اس دنیا پر پڑ رہے ہیں، اُس کی طرف توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔ انسان اقتدار اور طاقت کے نشے میں کس طرح اس اختیار اور قوت کا اندھا دھند اور آزادانہ استعمال کرتا ہے اس کی ایک جھلک اُن کے ایک افسانے ''بیل کہانی'' میں ملتی ہے۔ یہ سرکاری سانڈ ہے۔ اُس کی بدمستیاں، شہوت پرستی اور ظلم درحقیقت ہمارے اربابِ اختیار پر ایک گہرا طنز ہے۔ یہ عوام کو زمین کے حقیر کیڑے مکوڑے سمجھتے ہیں اور خلقِ خدا پر مظالم ڈھاتے، اپنے انجام سے بے خبر رہتے ہیں۔ مثلاً:

''ہاں مجھے لگتا ہے کہ خدا نے آدمیوں کی طرح جانوروں میں بھی آقا اور غلام مالک اور مزدور کی تخصیص برقرار رکھی۔ میں جب کبھی اسے پیٹ بھر جانے کے بعد کسی گلی کے موڑ یا چوراہے پر کھڑے جگالی کی چیونگم چباتے دیکھتا تو مجھے لگتا وہاں سے گزرنے والے گدھوں میں جُتے، بوجھ تلے پسنے اور ڈنڈے کھاتے اس کے ہم نسل اسے حسرت سے دیکھتے اور اپنے پیدا کرنے والے سے فریاد کرتے ہوں گے کہ اے پاک پروردگار یہ تمھارا انصاف ہے کہ کام کرنے اور بوجھ کھینچنے والے تو ڈنڈے کھائیں اور وہ مشٹنڈا جو کام کرتا ہے نہ بوجھ کھینچتا ہے اُسے کھانے، چرنے اور ہر جگہ گھومنے کی پوری آزادی ہے (۶)۔''

منشا یاد کا سیاسی اور سماجی شعور اُن کے افسانوں میں ایسی کئی تصاویر پیش کرتا ہے۔ ہر وہ محنت کش جس کو اپنے خون سے بھی ٹیکس دینا پڑتا ہے، جسے سانس لینے کی بھی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، اللہ سے یہی سوال کرتا ہے کہ اُس کے حکمرانوں کے غیر ملکی دورے، حج عمرے اُس کے ٹیکس اور کمائی پر پلنے والے سانڈ کیا اللہ سے لمبی چھٹی لے کر اس کام پر مامور ہیں۔ اسی فلسفے کو اسی افسانے میں ایک اور جگہ یوں بیان کیا گیا:

''ہاں۔ چاچا اندھی طاقت کی ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں چاہے جتنے

اختیارات حاصل ہو جائیں، یہ مزید اختیارات اور فتوحات پر اکساتی ہے اور کسی بڑی کامیابی اور فتح پر بھی اکتفا نہیں کرتی۔ دو ایک آدمی مغلوب ہو جائیں تو مزید آدمیوں کو ٹٹکاری پر لگانے کی کوشش کرتی ہے۔ سپہ سالار ایک دو ملک فتح کرے تو سکندر اعظم کی طرح پوری دنیا پر قبضہ کرنے کو اُٹھ کھڑا ہوتا ہے (۷)۔''

یہ منشا یاد کے عصری شعور کا ہی ایک پہلو ہے کہ جو اُنھیں مذہبی منافقت، انتہا پسندی، ریاکاری اور مولویانہ فطرت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ احتجاج ایک طرف تو منشا یاد کی انسان دوستی اور عالمگیر اخوت کا اظہار ہے تو دوسری طرف قدامت پسندی، رجعت پسندی اور اڑیل پن کے خلاف بغاوت ہے۔ اُن کا افسانہ ''بچھو حکایت'' بہت ہی خوبصورت انداز میں ان تمام مسائل کو پیش کرتا ہے جو آج کے دور میں فتنہ و فساد کا باعث ہیں۔ ''بچھو حکایت'' کئی اہم حقائق کا انکشاف کرتا ہے جیسے مشرق اور مغرب کے بیچ صرف ارضی فاصلہ ہی نہیں بل کہ علم کی بھی ایک طویل خلیج حائل ہے۔ مغرب علم اور سائنسی میدان میں بہت آگے ہے اور محض اپنی مشرقیت پر نازاں ہونا سوائے جہالت کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس افسانے میں موجود باریش پاکستانی بزرگ کا کردار اُس ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے جس میں پاکستانی معاشرہ مبتلا ہے۔ اس کردار کی ذہنی اور نفسیاتی تہوں کا بڑا عمیق مشاہدہ پیش کیا گیا ہے۔ خاتون اور بزرگ کے مکالمے آج کے دور میں اُٹھنے والے کئی سوالات کے جوابات پیش کرتے ہیں۔ معاشرے میں موجود بچھوؤں کی فطرت کی بھرپور عکاسی ہے۔ مثلاً:

''دیہات میں اکثر مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ زیادہ تر بچوں، عورتوں اور نادار لوگوں کو ہی کیوں ڈستے ہیں۔ جونہی کوئی شخص اندھیرے میں لکڑیاں اٹھانے، مزدور کدال سے مٹی کھودنے یا کوئی شخص چارپائی سے اُتر کر جوتا پہننے لگتا ہے۔ اسے تاک میں بیٹھا بچھو کاٹ لیتا ہے۔ اُپلے تھاپنے والی عورتیں، کوڑا اُٹھانے والی بھنگنیں اور آنکھ مچولی کھیلتے لڑکے لڑکیاں اکثر اس کا شکار ہو جاتے ہیں (۸)۔''

یہاں بہت سے سوال پیدا ہوتے ہیں کہ کیا بچھو کی فطرت ہے کہ وہ صرف کمزور کو ہی ڈسے گا؟ جو شخص مٹی، گوبر یا گندگی وغیرہ سے دور رہے یا اندھیروں سے محفوظ رہے اُسے نہیں ڈسے گا۔ منشا یاد کی سیاست اور ملکی نظام پر گہری نظر ہے۔ خودکش حملوں نے جس طرح آج کے انسان کو مضمحل کر دیا ہے اس سے پیدا ہونے تمام مسائل کا منشا یاد کو گہرا ادراک ہے۔ جس کا اظہار اُن کے بیشتر افسانوں میں ہوتا ہے جیسے ''سائیکلوسٹائل وصیت نامہ''۔ اس افسانے میں مذہبی جنونیت اور لیڈروں کی عاقبت نااندیشی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ کس طرح ان طالع آزماؤں نے عوام کو اپنے اغراض کی سولی پر

لٹکا رکھا ہے، کس طرح یہ معصوم ذہنوں کو مذہبی افیون سے مدہوش کر کے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کا آلہ کار بناتے ہیں، اس کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ مولانا سراج الدین کا کردار آج کے اُن تمام مذہبی انتہاپسندوں کی نمائندگی کرتا ہے جو مذہب پر عمل کرنے کا مطلب قدامت پرستی سمجھتے ہیں۔ مذہبی عقیدت کے نام پر خود کو ایسی شریعت کا پابند کر لیتے ہیں جو نافذ ہی نہیں کی گئی، خودغرض ملاؤں کے لیے مذہب گویا موم کی ناک ہے جدھر چاہا موڑ لیا۔ ذاتی مقاصد کی برآوری کے لیے ملامنا پلی کورے کاغذ کی مانند ذہنوں کو داغدار کر کے خودکُش حملے کرواتے ہیں اور لاشوں کو کیش کرتے ہیں۔ ''سائیکلو سٹائل وصیت نامہ'' انھی تصورات کے بیان کی ایک کڑی ہے۔ ایک طرف تو منشایاؔد مذہبی ریاکاری کے خلاف آواز اُٹھاتے ہیں تو دوسری طرف سیاست کی سیاہ کاریاں بھی اُن کا اہم موضوعِ بحث ہے۔ اُن کا ایک افسانہ ''فاختہ تو پاگل تھی'' ہمارے سیاسی نظام پر کڑی تنقید ہے۔ علامتی رنگ میں لکھا گیا یہ افسانہ ڈکٹیٹر کے استحصال، عوام کی بے بسی کی عمدہ تصویر ہے۔ یہ افسانہ معاشرے کے اُن رِستے ناسور کی نشاندہی ہے جس نے ہمارے پورے نظام کو قریب المرگ کر دیا ہے۔ فصلی بٹیرے وقت کے حکمرانوں کی بیساکھیاں بن کر کمزوروں کو روندتے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ، بیوروکریسی ان ظالموں کو آکسیجن فراہم کرتی ہے، ان تمام نکات کو بڑی عمدگی سے علامت کے رنگ کی آمیزش سے اس افسانے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ نظام میں عدالتی نظام کے بے بسی کی بھی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ جیسے یہ اقتباس:

''گدھ راج میں برکت۔ سبحان تیری قدرت''

> ''ہواؤں، فضاؤں میں جیسے زلزلہ سا آ گیا۔ چڑیوں، چمونے، جگنو، تیتر، کبوتر، فاختائیں اور دیگر کمزور پرندے پریشان ہو گئے۔ مگر کوؤں، ڈھوڈروں، توتوں، لالیوں، الوؤں، چیلوں اور شکار کرنے والے دوسرے پرندوں نے لڈیاں ڈالیں اور جشن منائے (۹)۔''

منشایاؔد ایک مصوّر، نقاد اور نبض شناس ادیب کی طرح اپنے مقاصد بیان سے پوری طرف آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ افسانہ نگاری کے میدان میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ زمانے کے نشیب و فراز کو بڑی بلیغ نظری سے دیکھتے ہیں۔ جس انسان نے گاؤں سے سکول تک ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پتھریلے راستے پر ننگے پاؤں سفر کیا ہو وہ معاشرے کی اونچ نیچ کو کس طرح نظرانداز کر سکتا ہے؟ اساڑھ کی گرمیوں میں انگارہ ہو چکے کنکر پتھر بچپن ہی میں اُنھیں اتنا حساس اور بالغ نظر کر گئے کہ تمام عمر ایک ماہر کوہ کن کی طرح وقت کے سمندر سے نئے نئے موضوعات اخذ کر کے لفظوں کا پہناوا پہنا کر افسانے تخلیق کرتے گئے۔ لہو کی وہ ننھی ننھی بوندیں جو اُن کے تلوؤں پر نمودار ہو کر کنکر پتھروں کو رنگیں کر گئی تھیں، جب قلم کی نوک سے نکلیں تو افسانے کے حیرت کدے میں کئی رنگ بھر گئیں۔ وقت کا استعارہ اُن کے کئی افسانوں

کی زینت بنا کہ انسان کس طرح بیک وقت دو دنیاؤں میں سفر کرتا ہے۔ایک طرف تو اُس کے اندر کا بت خانہ ہے جو اُن تمام تبدیلیوں سے مستثنیٰ ہے جو وقت کی زد میں آ کر وقوع پذیر ہوتی ہیں۔یہ انسانوں اور چیزوں کو داغدار کر دیتی ہیں،اس کے بے رحم ہاتھوں سے حسن اپنی دلکشی کھو بیٹھتا ہے،دوسری طرف تغیر کا ثبات ہے،وقت کا اشہب ہے جو بغیر کسی مہمیز کے دوڑا چلا جاتا ہے۔ان تمام پہلوؤں کو منشا یاد نے اپنے بیشتر افسانوں میں سمویا ہے۔مثلاً ''پنجرے والا گھر''،''توتے کی آنکھ''،''خواہشیں سراب ہیں،۱۹۷۸ کا آخری افسانہ پناہ''،اور''جیکو بچھے'' وغیرہ۔

ان افسانوں میں کردار دو دنیاؤں میں سانس لیتے ہیں۔ایک حقیقت کی دنیا میں جہاں زماں کی عمل داری ہے اور دوسری باطن کی دنیا جو خواہشوں کے پھولوں سے لدی پھندی باہر کے سراب کو بھی منزل سمجھ لیتی ہے۔یہ باطن کی دنیا ہی دراصل فریبِ نظر ہے جو باہر کی دنیا کو ایسے دیکھنا چاہتی ہے جیسے وہ ہے نہیں بل کہ جیسی وہ ہونی چاہیے۔اس میں ذرا برابر بھی شک نہیں کہ واقعی چیزوں کو بہت کم ویسے دیکھا جاتا ہے جیسی وہ ہوتی ہیں۔زیادہ تر دیکھنے والا اپنے مطابق دیکھتا ہے۔ اس فریب کا ذکر منشا یاد بڑی خوبی سے کرتے ہیں جو چمکتی ریت کو پانی سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔یہ اسی ہنرمندی کا اثر ہے کہ وہ ایک حقیقت نگار کے طور پر انسان کے باطن کی کہانیوں کو اُس کی حقیقی دنیا سے اس طرح نتھی کرتے ہیں کہ کہانی صحیح معنوں میں افسانہ بن جاتی ہے۔

منشا یاد کے افسانے جا بجا تاریخی حوالوں سے بھی مزین ہیں۔مثلاً پاکستان کا دولخت ہونا،زلزلے کا آنا اور اُس کی تباہ کاریاں،دہشت گرد حملے،بم دھماکے،مارشل لا کا لگنا وغیرہ۔ٹیکس چوری،مالی استحصال جیسے گھن جو ہمارے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں،منشا یاد کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔وہ تاریخی حقائق اور سماجی طنز کے ذریعے معاشرے کے تعفن زدہ جوہڑ میں چند کنکر ضرور پھینکتے ہیں۔منافقت نے دھوکہ دہی کا وہ بازار گرم کر رکھا ہے جس میں ''جنگل کا قانون'' ارباب اختیار کو من مانیاں کرنے کا بھرپور موقعہ دیتا ہے۔ان لوگوں کے لیے اخلاقی قدریں محض ریت کی دیواریں ہیں جنھیں جب چاہا ڈھا دیا۔منشا یاد کے افسانے انھیں سلگتے موضوعات کا نوحہ معلوم ہوتے ہیں۔

''ٹھہرا ہوا پانی''امام مسجد کی ذہنی پسماندگی کا بیان ہے تو''پنجرے میں بسیرا''محب وطن پاکستانی جو غیر ممالک میں بستے ہیں اور پاکستان کے حالات پر کفِ افسوس ملتے ہیں کی روداد ہے۔پولیس کو ہمارے معاشرے میں ناپسندیدگی سے دیکھا جاتا ہے۔مگر منشا یاد کی انسان دوستی اور محبت اُن کے لیے بھی درد محسوس کرتی ہے جو مختلف چیک پوسٹوں پر ڈیوٹی کرتے ہیں اور بڑی آسانی سے دہشت گردوں کا نشانہ بنتے ہیں۔دوسری طرف معاشرے کی عدم برداشت اور پولیس کا ظلم ہوتے دیکھ کر آنکھیں بند کر لینا بھی بیان کیا گیا ہے۔جیسے سانحہ سیالکوٹ کا ذکر کیا گیا ہے۔ایک حساس دل پر کوئی خاص واقعہ بہت دیر پا اثرات رکھتا ہے۔منشا یاد کے ذہن پر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کا حضرت اسماعیل کی گردن

پر چھری چلانے والا عمل بڑی گہری چھاپ رکھتا ہے۔ وہ اکثر اپنی نگارشات میں اس تلمیح کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ''بوکا'' تماشا، دام شنیدن میں اس تاثر کو پیش کیا گیا ہے۔ تماشا میں اسی احساس کو اس طرح پیش کیا گیا:

''پھر میں نے دیکھا تم ٹھنڈ کی وجہ سے سمٹے ہوئے ہو۔ میں نے تمھارے اوپر چادر ڈال دی جیسے اکھاڑے میں تمھارے گلے پر چھری چلانے اور تمھیں دوبارہ زندہ کرنے کے لیے ڈالا کرتا ہوں۔ مگر رات کے اس اُداس پہر میں مجھے اپنا چادر ڈالنے کا یہ انداز بہت ہی نحس معلوم ہوا اور نیند اُڑ گئی (۱۰)۔''

اس عمل کو ایک اور جگہ وہ اسی افسانے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''صاحبان۔۔۔قدردان۔۔۔کوئی باپ اپنے بیٹے کی گردن پر چھری نہیں چلا سکتا۔۔۔نہ ہی اللہ کے پیغمبروں کے سوا کسی میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہوسکتا۔۔۔یہ سب کچھ ایک کھیل ہے۔۔۔نظر کا دھوکا۔۔۔اس پاپی پیٹ کی خاطر (۱۱)۔''

''بوکا'' میں وہ یوں اس بات کو لکھتے ہیں:

''میں اسے زمین پر لٹاتا، گردن پر چھری رکھتا اور چلانا چاہتا ہوں۔ وہ کہتا ہے آنکھوں پر پٹی باندھ لو۔ میں آنکھوں پر پٹی نہیں باندھتا اور اللہ اکبر پڑھ کر چھری چلا دیتا ہوں اور یہ دیکھ کر میری چیخ نکل جاتی ہے کہ اس کی جگہ تم ذبح ہوئے پڑے ہو۔۔۔استغفار بیٹا۔۔۔اللہ تمھاری عمر دراز کرے (۱۲)۔''

''دام شنیدن'' میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

''کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ عام آدمی کسی ہم زبان اور ہم جنس کو قتل تو کر سکتا ہے۔ حلال نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے پیغمبروں کا دل اور حوصلہ درکار ہے۔ اُنہیں بھی آنکھوں پر پٹی باندھنا پڑتی ہے (۱۳)۔''

منشایاد کے افسانے انسانی رشتوں کی تصویر کشی میں کمال رکھتے ہیں جیسے والدین اور اولاد کا رشتہ جو اپنے اندر بہت گہرائی رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک آزمائش بھی ہے کیونکہ اولاد کی محبت والدین کو ایسے ایسے کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جو عام حالات میں کوئی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اُن کے افسانے ''کاشی'' اور ''آدم بو'' میں اسی قسم کا بیان ملتا ہے۔

منشایاد نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی وہ اُن کے فکر و خیال کا یک لازمی جزو بن گیا۔ گاؤں کی

زندگی، کھیت کھلیان، لوک گیت، ماہیے ٹپے، پنجابی زبان کی کہاوتیں، عوامی لب ولہجہ اُن کے افسانوں میں ایک مستقل حیثیت سے موجود ہے۔ وہ ایک تائب شاعر ہیں مگر اپنی نثر کو شاعری کی مختلف اشکال سے مزین کرتے ہیں۔ شاعرانہ وسائل سے بقدرِ ضرورت فائدہ اُٹھاتے ہیں اور تشبیات واستعارات، علامات کا بڑا سنبھل کر استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسے فنکار ہیں جو اپنے مشرقی ہونے پر نازاں ہیں۔ اُن کو توتوں، لالیوں، فاختاؤں بطخوں سے محبت ہے۔ اُنہیں وہ کاگ اچھا لگتا ہے جس سے ہماری کئی دیہی روایتیں وابستہ ہے۔ ڈب کڑھبا، کالا، کالو، ڈبو سے اُنھیں اپنائیت ہے۔ اگرچہ وہ ایک عرصے سے اسلام آباد میں مقیم ہیں مگر اپنے گاؤں کے کھیت کھلیان اُن کے اندر بستے ہیں۔ اُن کی روح میں سانس لیتے ہیں۔ کوڈ فقیر کی بے سری آواز بھی اُن کو پسند ہے۔ جب وہ گاتا ہے:

''اچیاں محلاں والیے پا دے خیر فقیراں نوں''

''تماشا'' میں باپ بیٹا شاہ حسین کی کافی گاتے ہیں:

''میں وی جاناں جھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلے''

مولوی عبدالستار کا ستوارہ ''ساجھے کھیت کی ہیروئین گنگناتی ہے۔ مقامی الفاظ جیسے سخر، خچرا، پسار وغیرہ کا بھی استعمال ملتا ہے۔ کئی افسانوں کا آغاز حمد وثنا سے ہوتا ہے جیسے ''ماس اور مٹی''۔ رُکی ہوئی آوازیں، میں اندازِ تحریر بامحاورہ نثر میں نہیں ہے۔ منشا یاؔد مکالماتی انداز کی پیش کش کے بھی ماہر ہیں۔ جیسے ''رہائی'' ''گیارہواں سیل'' سلاٹر ہاؤس'' ''بچے اور بارود'' میں یہ انداز موجود ہے۔ ''بچے اور بارود'' میں مکالماتی انداز ایک انٹرویو کی شکل میں ہے۔ جس کی بہت ہی دلکش اور معنی خیز صورت ہمارے سامنے آتی ہے۔ صیغہ واحد متکلم اور صیغہ واحد غائب اُن کے اکثر افسانوں میں موجود ہے۔ منشا یاؔد کے مطابق وہ کثرت سے واحد متکلم کا صیغہ اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ کہانی حقیقت اور افسانے کا امتزاج لگے۔ عام انداز سے لکھی گئی کہانیاں اُنھیں اوپری سی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ فلیش بیک کی تکنیک بھی استعمال کرتے ہیں۔ ''دیدہ یعقوب'' اور سزا بڑھا دی اسی تکنیک کے تحت لکھے گئے ہیں۔

منشا یاؔد کی کہانیوں میں موضوعات اور جذبات کا تنوع ہے۔ اُن کی پہلی کہانی کنول تھی اس میں اُن کی والدہ کی وفات نے اُن کے اندر ایسا کرب بھر دیا جیسے لفظوں میں ماتم پرو دیا جائے۔ ایک کم عمر بیٹے کے جذبات کی بھرپور عکاسی ہے۔ سارنگی اور تیرھواں کھمبا، ناکام محبت کے جذبے کو پیش کرتا ہے۔ ''کچی پکی قبریں'' جہاں طبقاتی تقسیم کو پیش کرتا ہے وہاں کوڈ فقیر کی عشق کی اُس آگ کی نمائندگی کرتا ہے جو اُس کو اس قدر جلاتی ہے کہ وہ نوراں کی شادی پر انتقام لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ''تیرھواں کھمبا'' بھی جہاں ناکام محبت کو پیش کرتا ہے وہاں تیرہ کا ہندسہ مختلف کہاوتوں اور طعنوں کی مدد سے اس جذبے کو اور شدت بخشتا ہے۔ اُن کے افسانوں میں جلوت میں خلوت، فطرت سے دوری کا کرب، روٹین کی چکی میں

پسنے سے چڑ چڑاہٹ کا احساس بڑی واضح شکل میں ملتا ہے۔ اپنی روٹین، اپنی فطرت اور عادات کا اسیر انسان ان سب سے چاہ کر بھی چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اس کی عکاسی ''اپنا گھر'' میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جبلتوں کی سطح پر جینے والے وہ انسان جو آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جب جدید انسان نئی دنیاؤں کی تسخیر کر رہا ہے ایک سوالیہ نشان کی طرح موجود ہیں کی بھرپور عکاسی ہے۔ اتنی ترقی کے باوجود گاؤں کا کمی اُسی طرح چودھری کے پاؤں میں بیٹھا ہے جیسے ''باگھ بکھیلی رات'' میں اس کو یوں بیان کیا گیا:

''ان کمی کمینوں کے پاؤں تلے زمین ہی کتنی ہوتی ہے''

اس طرح جبلّتوں کی سطح پر جینے والے لوگوں کو کچھ اس طرح پوٹریٹ کیا گیا ہے:

''وہ حرام حلال کے چکر میں نہیں پڑتے تھے۔ کچھوے، بلیاں، گیدڑ نیولے سب کچھ کھا جاتے تھے۔ مرے ہوئے مویشیوں کا ماس، کتوں اور گدھوں سے چھین کر ہڑپ کر جاتے تھے ماس کھانا اُنہیں بے حد مرغوب تھا۔ خواہ وہ مرے ہوئے مویشیوں کا ہو یا مارے ہوئے مویشیوں کا۔۔۔۔ ہم آپ مردار جانور یا مویشی کا ماس نہیں کھاتے۔ کھانے کے لیے اسے خود مار لیتے ہیں۔ ہم زندہ مویشیوں کی بوٹیاں نہیں اُتارتے زندہ انسانوں کی بوٹیاں اُتار لیتے ہیں۔ لیکن وہ الگ مسئلہ ہے (۱۴)۔''

کتنا خوبصورت امتزاج ہے جبلتوں کے مارے انسان کا اور اُن کا جو زندہ انسانوں کی بوٹیاں اُتارتے ہیں مگر پھر بھی مہذب کہلاتے ہیں۔ ایک گہرا سماجی طنز ہے جو منشا یاؔد نے پیش کیا ہے۔ انسان کی صدیوں کی بھوک نے اُسے کبھی چین نہیں لینے دیا چاہے وہ پیٹ کی بھوک ہو یا اقتدار کی، طاقت کی، جنس کی، منشا یاؔد ان صدیوں کی بھوک کے تاثر کو بڑی شدومد سے پیش کرتے ہیں۔ مثلاً ''پولی تھین'' جس میں بھوک کا مارا شخص پولی تھین بیگ تک کھا جاتا ہے اور اس طرح یہ بھوک اُسے موت کے منہ میں لے جاتی ہے۔ ''راستے بند ہیں'' میں بھی ایک بھوکا انسان صرف کھانے کی چیزوں کو حسرت بھری نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ نظروں سے ہی لذت کشید کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مہر و سانسی جیسے لوگ کھا کھا کر قے بھی کر لیں مگر بھوک نہیں مٹتی۔

''پانی میں گھرا ہوا پانی'' میں دتو کمہار پانی ہے اور زیناں آگ۔ دتو تو چاہ کر بھی باوا تلاش نہیں کر پاتا مگر اسی دوران میں اس کے آنگن میں ننھا سا شرینہہ اُگ آتا ہے۔ جس کا بیج نہ جانے کیسے آ جاتا ہے۔ شاید رمجو کی بدولت۔ اس افسانے کا آخری جملہ اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔ منٹو کے افسانوں میں بھی آخری جملہ اسی طرح چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ منشا یاؔد منٹو سے بھی متاثر تھے جس کا واضح اظہار اُن کے ''منٹو کے نام ایک خط'' میں ہوتا ہے۔ ہتک کی سوگندھی کے

طرح منشایادؔ بھی کبھی کبھی پسے ہوئے طبقے میں انانیت کی موجودگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ''پانی میں گھرا ہوا پانی'' کا آخری جملہ ملاحظہ ہو:

''ہاں مجھے یقین ہے کہ پورے گاؤں میں ایک ہی ایسا آدمی ہے جو اُن چیزوں سے محبت کر سکتا ہے جو اُس نے نہ بنائی ہوں (۱۵)۔''

منشایاد کی منظر نگاری اور بیانیہ اپنی جگہ اہم مقام رکھتے ہیں مثلاً ''بند مٹھی میں جگنو'' میں لکھتے ہیں:

''سچ مچ کے بادلوں اور اصلی دھوپ میں آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ سورج لمبی لمبی زبانیں نکال کر سرمئی بادلوں کے نحیف جسموں سے نمی چاٹ رہا تھا (۱۶)۔''

''باگھ بگھیلی رات'' میں اُن کا انداز کچھ ایسا ہے:

''گلیوں میں اُداسی کی دھول اُڑنے لگی، درخت سرگوشیاں کرتے، آہیں بھرتے اور گلیوں کے آر پار کی کچی پکی دیواریں ایک دوسرے کے گلے سے لگ کر بین کرنا چاہتیں (۱۷)۔''

یہ خوبصورت بیانیہ اداسی کا اور ماتم کا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جیسا موسم انسان کے اندر کی دنیا کا ہوتا ہے ویسے ہی اُسے باہر کی دنیا نظر آتی ہے۔ ایک اعلیٰ افسر کے سجے سجائے گھر کو ایک ادنیٰ گریڈ کے نوکر کی نظر سے منشایادؔ نے کچھ اس طرح پیش کیا:

''سجا سجایا ڈرائنگ روم اس کے دو کمروں کے کوارٹر سے زیادہ کشادہ اور نہایت خوبصورت تھا۔ کھڑکیوں کے بیش قیمت اور نفیس پردے خوشنما قالین اور عالیشان صوفے دیکھ کر اندر داخل ہوتے ہوئے اُسے جھجک محسوس ہونے لگی (۱۸)۔''

اسی پس منظر میں وہ ایک کم تر ادنیٰ ملازم کی ذہنی کشمکش کا بیانیہ پیش کرتے ہیں جو اُسے اپنے حقیر ہونے کا احساس دلاتا ہے؛ اُسے سب نظریں ہتک آمیز لگتی ہیں؛ اُسے یوں احساس ہوتا ہے جیسے وہ بالشت بھر کا ہو گیا ہو اور اُسے تمام افسر زمانے کے خدا نظر آتے ہیں جن کے حضور وہ بخشش حاصل کرنے کھڑا ہے۔

منشایادؔ جزئیات کو منظر نگاری کے دوران میں نظر انداز نہیں کرتے اور بڑے موثر انداز میں اسے الفاظ کے سانچے میں ڈھالتے ہیں مثلاً ''پناہ'' میں وہ لکھتے ہیں:

''شہر کی بڑی سڑک ہے دونوں جانب عظیم الشان عمارتیں کئی کئی منزلہ ہوٹل پلازے، ائیر کنڈیشنڈ ریستوران اور بیکریاں، سیلف سروس شاپنگ سینٹرز۔۔۔ سپر

مارکیٹیں آرائش اور زیبائش کے ساماں سے لباب دکانیں لمبی چمکیلی کاریں، ہنستے
مسکراتے خوش جمال، خوش حال اور فارغ البال لوگ (۱۹)۔''

منشا یاد کے افسانوں میں علامتی رنگ، شاعرانہ ادا، سماجی طنز، عوامی الفاظ فلسفیانہ نقطہ نظر، وجودیت کا فلسفہ، جبلّتوں کا بیان اس قدر خوبی سے ہوا ہے کہ اُن کے فن وفکر کے عناصر آپس میں گھُل مل گئے ہیں۔ منشا یاد زندگی کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، زندگی کے مختلف پہلوؤں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، اُن کا فلسفہ حیات کیا ہے؟ اُن کی شخصیت کس کس سے متاثر ہے ان تمام باتوں کا بیان اُن کے افسانوں میں موجود ہے۔ اُن کے افسانوں کو پڑھنے کا مطلب گویا منشا یاد کی شخصیت کا مطالعہ ہے' جب وہ اپنے افسانے میں یوسف زلیخا اور مرزا صاحبان کے اشعار پیش کرتے ہیں تو یہ اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ وہ پنجابی شعروادب اور روایتی شاعری سے کس حد تک متاثر ہیں۔ اُن کی علامتیں اُن کے باطن کی گہری سچائیوں کی ترجمان ہیں۔ عوامی الفاظ اُن کے اپنی تہذیب وثقافت سے جڑے ہونے کی علامت ہیں۔ مثلاً ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''شریفاں اکثر ان دونوں کا ذکر کرتی تھی اور کل شام وہ اسے ملنے بھی آتی تھیں مگر
اب پتہ چلا کہ وہ دونوں پھپھے کٹنیاں ہیں۔''
''جیٹھانی گروپ کی عورتیں چڑیلیں، ڈائنیں اور چھل بیریاں تھیں خون چوستی کلیجے
چباتی اور بڑے ول چھل جانتی تھیں۔''
''دیورانی گروپ کی عورتیں لُچیاں لفنگیاں اور مشٹنڈیاں تھیں وہ آنکھ مٹکا کرتی، چن
چڑھاتی اوت ادھل جاتی تھیں (۲۰)۔''

کبھی منشا یاد صاحب لکن میٹی کا ذکر کرتے، کبھی پینگ کے لمبے ہلارے کا، کبھی سکون کے تونبے سے بے فکری حاصل کرنے کا حوالہ دیتے ہیں، کبھی تیرہ تالن عورتوں کا۔ اکثر وہ اپنے افسانوں میں مخصوص زبان کا استعمال کرتے ہیں جیسے بچھو کہانی کی طرح بچھو کے ڈنگ مارنے اور بہت سے کیڑے مکوڑوں کے کلبلانے کا ذکر ''کوک بھرے کھلونے'' میں کرتے ہیں۔ اسی افسانے میں پھر سے وہ تاثر پیش کیا گیا جو بند مٹھی میں جگنو میں کیا گیا تھا جیسے وہ مٹیلک چھچھوندر کا ذکر کرتے ہیں جس نے اپنے باریک دانتوں سے آہستہ آہستہ بدن کو کترنا شروع کر دیا۔ اسی طرح بند مٹھی میں جگنو میں لکھتے ہیں کہ سوچ کی سخت جان اور بدشکل چھچھوندر اس کے دماغ میں تھوتھنی ڈالے مسلسل چیختی رہتی ہیں۔ اسی طرح ''دام شنیدن'' کی طرح ''جنگل کا قانون'' میں بھی مخصوص الفاظ ہیں۔ کہ آدمی کے منہ میں گوشت پھاڑنے والی کچلیاں ابھی مضبوط تھیں۔ اس طرح وہ ''دام شنیدن'' میں انسان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے منہ میں بھی بھیڑے کے دانت ہوتے ہیں۔

''پنجرے والا گھر'' میں بھی اسی انداز کا بیان ہے کہ دو ہڑوں اور کافیوں کے بول لمبی چونچوں والے کٹھ پھوڑے بن کر رات رات بھر اس کے چندن بدن پر چونچیں مارتے رہتے۔ منشا یاد کے افسانوں میں وجودیت کے فلسفے کی بھی جھلک ملتی ہے۔ سارتر کی کہانی ''متلی'' کی طرح اُن افسانوں میں بھی کئی مقامات پر متلی کا ذکر ہوتا ہے۔ بُو کا احساس موجود ہے۔ یعنی ایسا احساس جس میں مبتلا ہو کر انسان کو اردگرد سے گھن آنے لگتی ہے۔ وجودیت کے فلسفے کے مطابق انسان کے پاس چوائس نہیں۔ وہ تنہا ہے۔ اکیلا ہے، بے بس ہے۔ ''خواب سراب ہیں'' میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

> ''میرے ساتھ ہمیشہ زیادتی کی گئی ہے۔ یہاں تک کے میرے پیدا ہونے میں بھی میرا عندیہ نہیں معلوم کیا گیا۔ سارے فیصلے مُجھ پر ہمیشہ ٹھونسے گئے ورنہ اگر میری مرضی کا دخل ہوتا تو میں خود فیصلہ کرتا کہ کس صدی، ملک اور شہر میں اور کن لوگوں کے درمیان پیدا ہونا چاہتا ہوں لیکن والدین کے انتخاب سے لے کر ہر رنگ نسل، عقیدے اور نام تک کے انتخاب میں میرا اپنا کوئی چوائس نہیں تھا۔ میرا قد، بت، ناک نقشہ، اور آواز جس کی وجہ سے بعد میں کئی طرح کی پیچیدگیاں اور مشکلیں پیدا ہوئیں مُجھے وراثت میں ملے۔ اس میں میری مرضی اور پسند بالکل شامل نہیں تھی (۲۱)۔''

''بند مُٹھی میں جگنو'' میں اپنے جسم سے مُردہ مچھلیوں کی بُو کا ذکر ہوا۔ مری مکھیاں اور گھن کے احساس کو شدّت سے پیش کیا گیا۔ موسیقی کو مُردہ کوّے سے تشبیہ دینا، انڈوں سے مُرغی کی بیٹ، روٹی سے برادے اور سالن سے مُردہ گوشت کی سرانڈ کا ذکر کرتے ہوئے بالآخر بات متلی پہ ختم ہوئی۔ ''اپنا گھر'' میں وہی فائلیں اور وہی ایک جیسے قے کیے لفظوں کا ذکر ہوا۔ ''دام شنیدن'' میں بھی قے اور بُو کا احساس موجود ہے۔ شبِ چراغ میں بُک سٹال سے سرانڈ اُٹھنے کا بیان ہُوا کہ ''تقریر سُنتے سُنتے اُس کا جی متلانے لگا اُسے اُبکائیاں آنے لگیں'' وغیرہ۔

منشا یاد کے افسانے جیسی ''درخت آدمی''، ''پنج کلیان''، ''شجر بے سایہ''، ''جیکو پچھے''، ''سارنگی''، ''وقت سمندر'' بلاشبہ بہترین افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ''لوہے کا آدمی'' آزاد تلازمہ خیال کی ایک جھلک پیش کرتا ہے۔ ''پناہ'' اور ''تیرھواں کھمبا'' بیانیہ کا عُمدہ تاثر لیے ہے۔ ''سانپ اور خُوشبو'' میں سوانحی حوالہ موجود ہے۔ الغرض منشا یاد کا فن افسانہ نگاری گویا ایک گُلدستہ ہے جس میں رنگ رنگ کے، بھانت بھانت کی خوشبو کے پھولوں کو مجتمع کیا گیا ہے۔ جیسے ''سلاٹر ہاؤس'' میں بہت ہی گہرا طنز موجود ہے۔ ''لفظوں سے بچھڑا آدمی'' شک اور غلط فہمی کے بیج کی آبیاری اور ببول کی کاشت کو پیش کرتا ہے۔ سارنگی میں ناکام محبت، خیالات کے تسلسل جیسے شعور کی رو کا بیان ہے۔؛ مائی فٹ،، میں انسان کے نفسیاتی

پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ ایک گٹھیا مگر بڑے عہدے پر فائز آدمی کی تذلیل دیکھنے والوں کو کیسی طمانیت دیتی ہے۔ دستار کو بطور علامت بڑی مہارت سے استعمال کیا گیا ''راتب'' میں آدم کی گندم سے رغبت اور روٹی ڈالنے والے سے ایک رشتے کی استواری کا احساس موجود ہے۔؛ کاشی، ڈھلتی عمر کے والدین کا سچ بیان کرتا ہے۔ بہت سے واضح اور غیر واضح کرداروں اور کہانی کے اجزا کو اس طرح ملا کر پیش کیا گیا ہے کہ منشا یاد کی افسانہ نگاری بلاشبہ اپنی مثال آپ معلوم ہوتی ہے۔

منشا یاد خود اپنی افسانہ نگاری کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ اُن کے ذہن میں طرح طرح کے مضامین آتے ہیں وہ دل ہی دل میں اُنھیں لکھتے رہتے ہیں۔ مثلاً وہ خود کو کوڈ و فقیر، علیا نائی، صادو ترکھان، شیدو، مہترانی، اوور ٹائم کا ٹانگے میں جتا گھوڑا، تیرہواں کھمبا اور راستے بند ہیں کا 'وہ' سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو محسوس کر کے خود ہی پر طاری کر کے لکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے اندر اذیت کی چکی لگی ہوئی ہے جو دکھوں کا آٹا پیستی رہتی ہے۔ انھیں خوشحال اور بے فکر لوگوں کی زندگی متاثر نہیں کرتی بل کہ گرے پڑے، مفلوک الحال لوگ اچھے لگتے ہیں جو ان کے اندر کہانیوں کی تخلیق کا محرک بنتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ کوئی جانور پرندہ، ریل کا انجن، درخت یا کھمبا بن جاتے ہیں۔ بقول منشا یاد کہ میں جگ بیتی کو ہڈ بیتی بنالیتا ہوں میں ہر کردار کی کھال میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہوں۔

منشا یاد کے نزدیک افسانہ چاہے علامتی ہو تجریدی یا استعاراتی ہو، بنیادی چیز دلچسپی کا عنصر ہے۔ موضوع، مواد اور علامتوں کا تعلق اپنی معاشرت اور زمین سے ہونا چاہیے اور یہی تمام اصول ان کی افسانہ نگاری میں برتے گئے ہیں۔ ان کا مقصد تخلیق افسانے کے قاری تک رسائی حاصل کر کے ادبی معیار اور وقار قائم کرنا ہے وہ علامت کو تخلیق میں گہری معنویت پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں نہ کہ ہتھیار کے طور پر۔ اسی لیے ان کی کہانی ایک معمہ نظر آتی ہے۔ ان کا ہر کردار اپنے ماحول میں ڈھلا ہوا ہے۔ اور جہاں یہ مطابقت پیدا نہیں ہوتی وہاں المیہ کا جنم ہوتا ہے۔

منشا یاد کی افسانہ نگاری کو دیگر ناقدین کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ اور ان کی افسانہ نگاری ان کے نزدیک کیا اسرار و رموز رکھتی ہے، اس کا اندازہ ان چند آرا سے کیا جا سکتا ہے۔ جو ان کے بارے میں پیش کی گئیں۔ منشا یاد کی فنِ افسانہ نگاری کے بارے میں احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں:

> ''منشا یاد ایک ایسا ہی افسانہ نگار ہے جس نے اپنے اردگرد حصار نہیں اُٹھا رکھے ہیں بلکہ اس کے سامنے تو امکانات کے افق حدِ نظر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کی دُنیا میں اس کے بہت آگے بڑھ جانے، بہت دور نکل جانے کے امکانات موجود ہیں منشا یاد کے اس بے حصار رویے ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ اُردو

افسانے کی روایت کو اپنے جلوس میں لے کر چلتا ہے اور روایت سے دوستی اس شعور کے ساتھ کرتا ہے کہ وہ جدید دور کا ادیب ہے جو جدید دور کے بعض اپنے مخصوص تقاضے بھی ہیں، ادب کی ہر صنف کو اس ذہن کے نوجوان دستیاب ہوں تو پھر ادب کے مستقبل کا بول بالا سمجھیے (۲۲)۔''

ممتاز مفتی کہتے ہیں:

''شخصیت کے لحاظ سے منشایاد میں رورنگی ہے بیک وقت اس کی شخصیت سرخ بھی ہے اور سبز بھی اس میں قیام بھی ہے اور حرکت بھی پانی بھی ہے اور مٹی بھی مادہ بھی ہے اور انرجی بھی اس کی شخصیت فن کارانہ بھی ہے اور غیر فن کارانہ بھی (۲۳)۔''

مظفر علی سیّد کے خیال میں:

''منٹو کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اپنی انا کو زیادہ سے زیادہ دبا رکھا ہے ان میں منشایاد کا شمار بھی لازم ہے۔ اس نے بہت سی چیزوں کو اپنی ذات میں جذب ہونے دیا ہے۔ اور ان سے زیادہ رنگا رنگ اشیا میں اور اشخاص میں خود کو جذب کیا ہے۔ اسے بقولِ خود ''لت پڑ گئی ہے'' اپنے اپ کو دوسروں کی جگہ رکھ کر دیکھے بلکہ ان کی کھال میں چھپ کر بیٹھ جائے۔ بقولِ انتظار حسین اس کا جی چاہے تو بکرے کی کھال میں بھی چھپ جائے۔۔۔۔۔ جیسا کہ اس نے ڈنگر بولی میں کیا ہی ء یہ صلاحیت اُس قوتِ مشاہدہ سے مختلف ہے جس پر ہمارے مکتبی ناقدین افسانہ اصرار کیا کرتے تھے (۲۴)۔''

مشرق اور مغرب کے ناقدین کی نظر میں منشایاد کا مقام اُنکے غیر معمولی اور قدآور افسانہ نگار ہونے پر دال ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:

''ماس اور مٹی کا خالق محمد منشایاد ایک پیدائشی افسانہ نگار ہے۔ کہانیاں اس کے گرد یوں پھرتی ہیں جیسے مدھ مکھیاں جنھیں شہد کی تلاش ہو یا گوپیاں جو ایک روشن نُقطے کے گرد رقص کرنے کی آرزو میں پاگل ہوگئی ہوں۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس تمثیل میں ''ماکھی'' یا روشنی کی اپنی کوئی حیثیت نہیں بلکہ اصل کردار ہی ان کا ہے کیونکہ اگر اس تمثیل سے ماکھی یا روشنی کو منہا کر دیا جائے تو مدھ مکھیاں بیدار ہی کیوں

ہوں؟ اور گوپیوں کی چھاگلوں میں جھنکار ہی کیسے پیدا ہو؟ ۔۔۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ خود منشا یاد کی شخصیت میں کچھ ہے کہ اسے دیکھتے ہی کہانیاں بے قراری ہو کر اس کی طرف لپکتی ہے۔ اور وہ اُنہیں چھو کر کیا سے کیا کر دیتا ہے (۲۵)۔''

وارث علوی کے خیال میں:

''اور جب کتاب میں نے پڑھی تو مجھ پر نہایت ہی منفرد فنکار کے تخیلی اعجاز کا انکشاف ہوا۔ اس کے بعد تو جتنی کتابیں آتی رہیں منشا یاد کی تخلیقی امیج اور فنکارانہ پختگی کا احساس دلاتی رہیں۔ میرا یہ احساس دن بدن قوی ہوتا چلا گیا، کہ بیدی اور منٹو کی نسل کے بعد افسانہ نگاروں کی جو نسل سامنے آئی ہے اس میں منشا یاد ایک قد آور افسانہ نگار ہیں۔ اور ادب کی تاریخ میں ان کے لیے صفحات محفوظ ہیں۔ نوادرات تراشنے والا تخیلی اور نہایت ہی ثروت مند زبان، حساس ترین الفاظ سے تشکیل پایا ہوا اچھوتا اسلوب اور تخیلی ذہن پر یکے بعد دیگرے روشن ہوتے ہوئے تاروں کی طرح روشن ہوتی کہانیاں منشا یاد کی عظمت کی نشانیاں ہیں (۲۶)۔''

امرتا پریتم نے منشا یاد کی کہانیوں میں لفظوں میں پوشیدہ احساسات کو روشنی فراہم کرنے کا ایک منبع قرار دیا ہے۔ وہ اُن کی کہانیوں کو طلوع ہوتے سورج کی لالی کے وقت پڑھی جانے والی کہانیاں قرار دیتی ہیں اُن کے مطابق منشا یاد کی کہانیاں ایک سان ہیں جن کے لفظ لفظ پر چڑھ کر انسان کی نظر تیز ہوتی ہے۔

محمد علی صدیقی کے نزدیک منشا یاد کی مقبولیت کی بڑی وجہ ایک بہت پیچیدہ مسئلہ کے بیان کے لیے اپنی کہانی کو بہت سادہ ابتدا کے ساتھ اور کہانی کے انجام تک کے مرحلے کو جدید لہجہ کی کاٹ کے ساتھ بیان کرنا ہے۔

انتظار حسین کی رائے میں تجریدی افسانے سے کہانی جب غائب ہوئی تو اُس کی تلاش کا عمل شروع ہوا۔ تب منشا یاد کے افسانوں پر نظر پڑی پتہ چلا کہ کہانی درحقیقت منشا یاد کے افسانوں میں چھپی بیٹھی ہے۔ گویا منشا یاد کے افسانوں نے افسانے میں کہانی کے عنصر کو پھر سے زندہ کیا۔ ورنہ علامتی اور تجریدی افسانے میں یہ مفقود تھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی منشا یاد کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''منشا یاد کی افسانہ نگاری کا یہ وصف ایسا ہے جس میں کوئی اُس کے برابر نہیں۔ وہ ہماری دنیا کے ہر پہلو ہماری زندگی کے ہر حادثے، ہمارے تخیل کے ہر تاریک یا روشن کونے کو اپنی گرفت میں با آسانی لے آتا ہے۔ موضوع کے اس غیر معمولی

تنوع کے آگے اسلوب کے تنوع کا احساس ماند پڑ جاتا ہے۔ آج کے افسانہ نگار جس بے چارگی سے معاصر زندگی کے نمایاں اور اخبار کی سرخیوں جیسے چیختے ہوئے مظاہر کو اخبار یا ٹی وی سے اُٹھا کر من وعن بیان کر دیتے ہیں ان کی بے چارگی کچھ کم ہو سکتی تھی اگر وہ منشایاد کے افسانے پڑھتے اور اُن سے کچھ سبق سیکھنے کی سعی کرتے (۲۷)۔''

منشایاؔد کے افسانے اُن کے محسوسات کے ایک خزانے کا نام ہیں۔ یکسانیت کا عنصر اُن کے افسانوں میں بہت کم ہے اور حیرت انگیز حد تک تنوع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جزئیات کا ستعمال کرتے ہیں۔ ابہام بھی پیدا کرتے ہیں۔ حواسِ خمسہ کو متحرک رکھتے ہیں۔

فرمان فتح پوری منشایاؔد کے افسانوں میں آدمیت سے پیار، انسان کی معصومیت بھولپن سچائی اور ملائمت کا ذکر کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق منشایاد کی کہانیوں کے تیز دھارے خواہ ان کا تعلق ماحول و پس منظر سے ہو یا کردار و مکالمات سے، عموماً دیہاتی زندگی کے پہلو سے پھوٹتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ پریم چند اور احمد ندیم قاسمی کی روایت کے افسانہ نگار ہیں مگر اپنی منزل تک رسائی کے لیے پگڈنڈی اُنہوں نے خود بنائی ہے۔ وہ دیہات کی کھردری لیکن معصوم زندگی کا شہر کی مہذب مگر منافق زندگی سے ایسا موازنہ پیش کرتے ہیں کہ انسان کا اصل روپ سامنے آجاتا ہے۔ منشایاؔد کے افسانوں کے موضوعات غربت، افلاس، معاشرتی ناہمواری احساس تنہائی، ذہنی انتشار سوچ کا الجھاؤ، روح کی بے چینی اور جسم کی بھوک وغیرہ ہیں۔

سید ضمیر جعفری نے منشایاؔد کی مقبولیت کا باعث اُن کی حقیقت پسندی، بے باکی اور اسلوب کی دلربائی کو قرار دیا ہے وہ اُنھیں روح کا مبصر قرار دیتے ہیں۔ اختصار، شیریں بیانی اور افسانے میں آپ بیتی کا انداز اپناتے ہیں۔ آفتاب اقبال شمیم کے مطابق ''منشایاؔد اپنے اندر پھیلے ہوئے غم کو زاویے بدل بدل کر قسطوں میں لکھ رہا ہے۔

عطاالحق قاسمی نے منشایاد کو تصویر کشی کا ماہر قرار دیا ہے۔ وہ اُنھیں ماہر نفسیات قرار دیتے ہیں کیوں کہ اُن کے افسانوں میں انسانی فطرت کی باریکیاں بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ پاکستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تاریخ کا کرب انگیز بیان بھی موجود ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''افسانہ منشی پریم چند سے چلتا ہوا، انتظار حسین تک اور انتظار حسین سے منشایاد تک پہنچا ہے اور اس کے سارے پیش رو اس پر فخر کرتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اب عہد جدید تر میں منشایاد سے بڑا افسانہ نگار کوئی نہیں۔ آج کا اُردو

افسانہ اگر شہر ہے تو منشایاد اس شہر کا دروازہ ہے (۲۸)۔''

امجد اسلام امجد کے مطابق محمد منشایاد جدید اُردو افسانے کا سب سے معتبر حوالہ ہے۔ اور وہ لکھتے ہیں:

''منشایاد اور اس کے بہت سے ہم عصر علامت نگاروں میں بنیادی فرق یہی ہے کہ وہ علامت کو Obsession نہیں بناتا اور اُسے اسی قدر استعمال کرتا ہے جتنی ضرورت ہو، اس کی کہانیوں میں موضوع اور ہیئت کا یہی خوبصورت توازن ہے جس نے اس کے اسلوب کو انفرادیت عطا کی ہے۔ ''بند مٹھی میں جگنو'' سے ''درخت آدمی'' تک اس کی بہت سی کہانیوں کا اسلوب جدید اور جدید تر ہونے کے باوجود اپنی زمین، ماحول، عوام، حقیقت نگاری سے اس طرح روشن اور معطر ہے کہ علامت نگاری کہیں بھی آپ کا راستہ نہیں روکتی، کہیں آپ کو گمراہ نہیں کرتی اور کہیں آپ سے پہاڑے نہیں سنتی (۲۹)۔''

ڈاکٹر انور سدید بھی منشایاد کو حقیقت نگار قرار دیتے ہیں۔ اور اُن کے کرداروں کو جانے پہچانے کردار سمجھتے ہیں۔ اعجاز راہی اُنھیں عصر حاضر کا ایسا کہانی کار بیان کرتے ہیں جو جوان، تازہ اور نئے موضوعات کو عالمانہ شعور اور تخلیق سے آراستہ کر کے پیش کر رہا ہے۔ جمیل یوسف منشایاد کو پاکستان کا سب سے بڑا افسانہ نگار سمجھتے ہیں۔ خالدہ حسین کے مطابق وہ عورت کے بنیادی مرکز اور شدید وابستگی کا ادراک رکھتے ہیں۔ رشید امجد جو بذات خود ایک بہت بڑے افسانہ نگار ہیں اور منشایاد کے ہمعصروں میں شمار ہوتے ہیں یوں رقمطراز ہیں:

''منشایاد ایک صاحب فن افسانہ نگار ہے۔ اس کی کہانیوں کا سماجی سیاسی دائرہ بہت وسیع ہے کہ اس نے کھلی آنکھ سے زمانوں کو گزرتے اور واقعات کو بیتتے دیکھا ہے۔ دیہات سے شہر اور شہر سے نئے شہر تک اس کے کردار پڑھنے والے کے اندر اُتر جاتے ہیں کہ منشایاد اُنہیں اپنے فن کے چاک پر اس مہارت سے ترتیب دیتا ہے اور تخلیق کرتا ہے کہ وہ ایک جیتا جاگتا کردار نہیں رہتے ایک علامت بھی بن جاتے ہیں۔ اس کے پاس گُتھی ہوئی کہانی جسے اس نے اپنے زندہ اور رواں اسلوب سے ایسی صورت عطا کی ہے کہ جدید افسانے میں اس کا نام اہم ہی نہیں منفرد بھی ہے، ایک طویل فنی ریاضت مشاہدے اور مطالعے نے اس کی کہانیوں کو اگر ایک طرف اپنے عصر سے جوڑا ہے تو دوسری جانب ان میں ماورائے عصر خوشبو بھی ہے۔ جدید

افسانے کی کوئی بھی تاریخ اس کے ذکر کے بغیر مکمل ہوگی (۳۰)۔''

جمیل آزر منشایاد کو منٹو کے بعد اُردو افسانے کا سب سے بڑ قد آور افسانہ نگار قرار دیتے ہیں۔ نجم الحسن رضوی منشایاد کو اُن کے افسانے ''درخت آدمی'' کے مماثل ایک ایسا ہی درخت قرار دیتے ہیں جس کی جڑیں اپنی دھرتی میں گڑی ہوئی ہیں اور اس کی کہانیوں کی ہری بھری ڈالیوں پر عصری صداقتوں کے پرندے چہچاتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال آفاقی اُن کی کہانیوں کو ہمارے عہد کی سیاہ کاریوں کی روداد قرار دیتے ہیں۔ وہ اُنھیں گرے پڑے، محروم اور استحصال زدہ لوگوں کا ترجمان قرار دیتے ہیں۔ منشایاد کی افسانہ نگاری پر ناقدین کی اتنی آرا ہیں کہ اگر لکھنے پر آئیں تو دفتروں کے دفتر بھر جائیں گے۔

ان تمام آرا کا نچوڑ یہی ہے کہ بلاشبہ منشایاد جدید افسانہ نگاری میں سب سے منفرد اور نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ وہ حقیقت نگاری اور علامت کے استعمال میں ایک خوبصورت توازن رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانے، اُن کی کہانیاں ہمارے دور میں سانس لیتی ہیں۔ وہ پاکستان کے اُفق پر ہونے والی تبدیلیوں کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی سطح پر کوئی ایسا پہلو نہیں جس پر اُن کی بلیغ نظر نہ ہو۔ وہ پیدائشی فنکار ہیں۔ قدرت نے اُن کے باطن کو کہانیوں کی نعمت سے مالا مال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہانیاں اُن کو مضطرب رکھتی ہیں۔ اُن کے افسانے پڑھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ ہمارے نہیں بل کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ منشایاد نے اپنے معاشرے میں موجود مختلف لوگوں سے تھوڑی تھوڑی وجود کی مٹی لے کر اپنے فن کی مدد سے اُسے ایسے گوندھا ہے کہ دراصل جو حقیقت اور کہانی پر مشتمل افسانوں کی تخلیق بن گئی ہے۔

اُن کے افسانوی مجموعے ''اک کنکر ٹھہرے پانی میں'' کے آخر پر موجود اُن کے افسانچے بھی جو ''مٹھی بھر جگنو'' کے عنوان سے ہیں گویا کلبلاتی کہانیاں ہیں جو قرطاس پر پھیلنا چاہتی ہیں۔ یہ منشایاد کی مختصر نویسی اور جزئیات نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔ ''تتلی کی موت''، ''مردے کھانے والا''، ''حجاب''، نجات میں طنز نمایاں ہے۔ جبکہ باپتا، درزی کا وعدہ، ''وہاں ایک باغ تھا'' آج کے عہد کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ ''دھماکہ'' میں انسانی نفسیات کے ادراک کی جھلک ملتی ہے'' وقت کی پابندی'' میں ہمارے معاشرے میں وقت کی ناقدری اور اُسے ضائع کرنے پر طنز کیا گیا ہے۔

منشایاد کے افسانچے بھی اُن کے افسانوں کی طرح متنوع موضوعات اور اسلوب کی کئی جہتیں لیے ہوتے ہیں۔ جو اندر کی تسکین کا اچھا ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔ منشایاد کا ''بند مٹھی میں جگنو'' سے لے کر ''اک کنکر ٹھہرے پانی میں'' تک کا افسانوی سفر بلاشبہ یادگار ہے۔ جس میں اُنھوں نے افسانوی ادب کو بہت کچھ دیا۔

حواشی:

(۱) اسلم سراج الدین، محمد منشا یاد: شخصیت و فن، مشمولہ منشا یاد ایک یاد گار انٹرویو (اسلام آباد: ڈاکٹر اسد فیض اکادمی ادبیات، ۲۰۱۰ء)، ص ۳۳۰۔
(۲) اقبال آفاقی ڈاکٹر، منشا یاد کے منتخب افسانے (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۷۔
(۳) منشا یاد، شہر فسانہ (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۶۔
(۴) ایضاً، ص ۲۸۹۔
(۵) منشا یاد، شہر فسانہ، محوّلہ بالا، ص ۲۸۸۔
(۶) منشا یاد، اِک کنکر ٹھہرے پانی میں (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۶۔۲۷
(۷) ایضاً، ص ۳۰۔
(۸) ایضاً، ص ۵۱۔
(۹) ایضاً، ص ۹۰۔
(۱۰) منشا یاد، شہر فسانہ، محوّلہ بالا، ص ۹۸۔
(۱۱) ایضاً، ص ۱۰۴۔
(۱۲) ایضاً، ص ۹۲۔
(۱۳) ایضاً، ص ۱۵۵۔
(۱۴) ایضاً، ص ۶۱۔
(۱۵) ایضاً، ص ۲۹۔
(۱۶) منشا یاد، شہر فسانہ، مشمولہ بند مٹھی میں جگنو، محوّلہ بالا، ص ۲۴۔
(۱۷) ایضاً، مشمولہ باگھ بلھیلی رات، محوّلہ بالا، ص ۵۴۔
(۱۸) ایضاً، مشمولہ اوور ٹائم، محوّلہ بالا، ص ۶۶۔
(۱۹) ایضاً، مشمولہ پناہ، محوّلہ بالا، ص ۵۸۔
(۲۰) ایضاً، ص ۲۷۔
(۲۱) ایضاً، مشمولہ خواہش سراب ہیں، محوّلہ بالا، ص ۷۲۔
(۲۲) اسلم سراج الدین، محمد منشا یاد: شخصیت و فن، مشمولہ منشا یاد ایک یاد گار انٹرویو (اسلام آباد: ڈاکٹر اسد فیض اکادمی ادبیات، ۲۰۱۰ء)، ص ۲۴۵۔
(۲۳) ایضاً، ص ۲۶۲۔۲۶۵
(۲۴) ایضاً، ص ۲۶۶۔۲۶۷
(۲۵) وزیر آغا، ڈاکٹر، دائرے اور لکیریں (لاہور: مکتبہ جدید پریس، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۰۷۔
(۲۶) اسلم سراج الدین، محمد منشا یاد: شخصیت و فن، مشمولہ منشا یاد ایک یاد گار انٹرویو، محوّلہ بالا، ص ۲۷۲۔
(۲۷) ایضاً، ص ۲۸۱۔
(۲۸) ایضاً، ص ۲۹۳۔
(۲۹) ایضاً، ص ۲۹۵۔
(۳۰) ایضاً، ص ۲۹۹۔

مآخذ:

آغا، ڈاکٹر وزیر، دائرے اور لکیریں، لاہور: مکتبہ جدید پریس، ۱۹۸۶ء۔
آفاقی، ڈاکٹر اقبال، منشا یاد کے منتخب افسانے، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۰۸ء۔
سراج الدین، اسلم، محمد منشا یاد: شخصیت و فن، مشمولہ منشا یاد ایک یاد گار انٹرویو، اسلام آباد: ڈاکٹر اسد فیض اکادمی ادبیات، ۲۰۱۰ء۔
یاد، منشا، شہر فسانہ، مشمولہ اوور ٹائم، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔
_____، شہر فسانہ، مشمولہ باگھ بلھیلی رات، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔
_____، شہر فسانہ، مشمولہ پناہ، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔
_____، شہر فسانہ، مشمولہ خواہش سراب ہیں، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء۔
_____، اِک کنکر ٹھہرے پانی میں، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔
_____، شہر فسانہ، مشمولہ بند مٹھی میں جگنو، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔
_____، شہر فسانہ، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔